مولانا پھر کلکتہ واپس آگئے اور اس وقت سے لے کر وفات تک اسی درسگاہ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۵۰ء میں لکچرر کے عہدہ سے ترقی کر کے پروفیسر تفسیر و حدیث ہو گئے تھے۔ لیکن میرے کلکتہ چھوڑنے کے بعد مدرسۂ عالیہ کے حالات میں جو ابتری پیدا ہوئی اس کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مولانا مرحوم کو پھر لکچرر کے عہدہ پر واپس کر دیا گیا اور پروفیسر کی جگہ پر ایک ایسے صاحب کا تقرر ہو گیا جو مولانا سے بھی جونیر تھے آخر اسی لکچرر کی پوسٹ پر وہ دنیا سے رخت سفر باندھ گئے۔

مولانا بڑے عابد و زاہد، متشرع اور صاحب صلاح و تقویٰ عالم تھے۔ گفتگو کم کرتے تھے لیکن جو بات کہتے تھے بچی تلی کہتے تھے۔ کئی برس سے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر تھے۔ مجلس کے جلسوں میں پابندی اور اہتمام سے شریک ہوتے اور بحث میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ ان کا یہ سفر بھی مجلس شوریٰ کے جلسہ میں شرکت کی غرض سے تھا۔ کلکتہ سے دہلی آئے اور دہلی سے دیوبند جا رہے تھے۔ اخلاق و عادات کے لحاظ سے بڑے خوش مزاج متواضع اور وضعدار تھے۔ جس سے جو رسم تھی اسے بہرحال نباہتے تھے۔ اس زمانہ میں جبکہ مستند ارباب علم و دین کا قحط چلا ہی جا رہا ہے۔ مولانا کی وفات علوم دینیہ کے حلقوں کے لئے ایک شدید حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مدارج و مراتب بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا ہو۔ آمین!

پچھلے دنوں پاکستان میں ہمارے ایک اور فاضل اور عزیز دوست رئیس احمد جعفری کا بھی انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے تعلیم ندوہ اور جامعہ دونوں میں پائی تھی۔ لیکن تکمیل کسی ایک جگہ بھی نہیں کی۔ تحریر کا شوق اور سلیقہ شروع سے تھا اور آدمی تھے بڑے ذہین اور طباع! اس لئے اپنے مطالعہ اور محنت کے بل بوتہ پر اردو زبان کے نامور ادیب اور مصنف بن گئے۔ ان کا قلم ہی ان کے لئے ذریعہ معاش تھا۔ اس لئے اگرچہ کوئی ڈھنگ کا علمی اور تحقیقی کام نہیں کر سکے لیکن افسانہ و ناول سے لے کر مذہب اور تاریخ و فلسفہ تک ہر موضوع پر چھوٹی بڑی کتابیں اس کثرت سے لکھیں کہ اس وصف خاص میں ان کا کوئی معاصر ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ ان کا قلم بڑا شگفتہ اور رواں دواں تھا۔ انکے ساتھ میرا ذاتی تعلق یہ تھا کہ مرحوم کے نانا سید امتیاز احمد صاحب (ریاض خیرآبادی مرحوم کے حقیقی بھائی) آگرہ میں کوتوال شہر تھے۔ ان میں اور میرے والد صاحب قبلہ میں نہایت گہرے برادرانہ تعلقات تھے۔ کوتوال صاحب